

بَرْج

شَرْك

شہزاد

مَجْرُوح سُلْطانِ پُوری

ناشر

حسامی بکٹ ڈیو، پچھلی کماں، حیدر آباد

۱۹۰۷ء۔ سعد دا۔

جملہ حقوق بحق مصنف حفظ

چھٹی بار

ڈسمبر ۱۹۸۴ء

خوشنویسی

سلام خوشنویس

قیمت پسندیدہ روپے

ناشر

حساری بک ڈپ

مچلی کمان، حیدر آباد ۲۰۰۵

مطبع

گولڈن پریس، گولی گڑہ، حیدر آباد

مجروح سلطانپوری

سچیلاغنے نزلگو

مجروح سلطانپوری غزل کے قصیل ہیں جو یہ ہے کہ دو رہاضر میں ان جیسا سجیلا اور طرح دار غزل گونایا۔ ہے۔ انھوں نے غزل کو سیاسی رمزیت ہی نہیں ترقی پذیر حیثیت سے روشناس کیا، دو چار براہ راست قسم کے شعر بھی کہہ ڈالے اور ان کو لے کر ایسا ہستگامہ مچا کر ان کی غزل کی طرح داری اور سجیلا پن اس شور میں دب گیا۔

در اصل مجروح کے سامنے ایک خیالی لدکا رہتی۔ جدید غزل جدید دور کے تقاضوں کو پوکار سکتی ہے؟ مخالفین کا اصرار ہتھ کر اول تو غزل کی ریزہ خیالی حائل ہوگی۔ دوسرے اس کی مخصوص لفظیات اور علامتوں پر جاگیر داران نظام کی جو چھاپ لگی ہے وہ اسے عصر حاضر کی انقلابی حیثیت کو اپنانے میں حارج ہوگی۔ تیسرا قافیہ ردیف کی مجبوریاں راہ روکیں گی۔ مجروح نے ان سب دعتوں کو آنکھیں کھوکھو کر تسلیم کی، اور بناء دیا اور اس طرح بناہ کر غزل کی لفظیات کو نئی تہذیب داری اور رمزیت ملی اور غزل کوئی سجاوٹ اور وقار۔

مجروح کے اس کارنائے کے سلسلے دو تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مجروح، جگر کے شاگرد نہیں پرستار البته میں۔ کہا یہ بھی جاتا ہے کہ آخر دو میں جگر نے جو سیاسی رمزیت کا انداز غزل میں اپنایا اس کی تحریک ایخیں مجروح کی غزل کے نئے آہنگ سے ملی تھی۔

جذبی غزل میں سایہ رمزیت کو سمجھی رہے تھے، پھر فیض کی غزل آئی۔ — مگر یہ ذکر بعدیں!

محروم نے غزل ہیں جن تقاضوں کو برداشت اور اصل وہ تقاضے تھے کیا؟ ترقی پسند تحریک شاعری کے کس قسم کے تقاضے کر رہی تھی اور ترقی پسند کی پہچان کیا تھی؟ سوال خاصاً بحاجا ہوا ہے۔ مگر بنیادی مسئلہ ان تقاضوں کی شناخت ہی کا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے بعض علم بردار ترقی پسند کی پہچان سمجھتے تھے:-

۱ براہ راست (خطیبات یا بیانیہ) انداز کو۔

۲ ہنگامی سیاست کے موضوعات پر اظہار خیال یا ان کے ذکر اور ان کے بارے میں پیغام عمل کو (یعنی ان کا تعلق ترقی پسند فکر کے بجائے وسیع تر حکمتِ علی (STRATEGY) اور قوتی طریق کار (TACTICS) سے تھا)۔

۳ بعض موضوعات کے تصویات کے دھرانے کو۔

اگر ترقی پسند کی سبھی پہچان ہے (اور مدت توں بعض تقاضوں کو اسی پر اصرار رہا) تو غزل تو کیا کسی بھی تخلیقی فن پارے میں اُسے پوری طرح برداشت اور برستتے رہنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ کیونکہ اس فارمولے میں فکر کا عنصر دبا ہوا ہے۔ داخلی احساس اور بخوبی تاثر کی گنجائش نہ ہونے کے برابر ہے اور شعری حسن کی لطیف رمزیت ناپید ہے۔

اس کے مقابلے میں اگر ترقی پسندی نام ہے براہ راست یا بالواسطہ، رمزیہ یا علایہ انداز میں:-

۱ فکر و احساس کے ایسے اظہار کا جو انسان میں سماجی تبدیلی کی خواہش پیدا کرے اور

۲ زندگی اور کائنات کی طرف صحت مند روایت پیدا کر سکے۔

تو لفظنا یہ ترقی پسندی وسیع تر آگئی سے عبارت ہوگی۔ صرف تحفظِ بنگال یا دوست نام کے موضوع پرشق سخن کافی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کسی شاعر یا ادیب کی تخلیقات سے جو جموقی تصورِ حیات ابھرتا ہے وہ حیات آفرین ہے یا زہر قائل اور سبھی جموقی نظریہ حیات یا زندگی کی طرف روایت کسی فن کا رکن کی عنظمت کی پہچان ہے۔

ہر دور اپنا نظریہ ساختہ لاتا ہے۔ یہ نظریہ زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتا رہتا ہے اور نئی قدروں میں ڈھنڈتا رہتا ہے۔ شہکت دریخت کا یہ عمل جاری رہتا ہے۔ غزل بخوبی تجربے کے عطر کو داخلی تاثر کی شکل میں پیش کرتی ہے۔ وہ محض تجربے کو بیان نہیں کرتی، اس تجربے سے حاصل شدہ تاثر کی مرکزی کیفیت کو پیش کرتی ہے۔ اس نے شاعر کسی نظریے کو جب تک تجربے میں اور پھر تجربے سے حاصل ہونے

والی بخی تاثر کی کیفیت میں نہ ڈھالے غزل میں اسے پیش نہیں کر سکتا۔ ایک بارہ عل ہولے تو پھر غزل کی محض لفظیات حارج نہیں ہوتی بلکہ ان کی توسیع ہوتی جاتی ہے اور رمز دایا کرنے ممکن حاصل کرتے جاتے ہیں۔ لیکن اگر یہ نظر ہے نہ بنا، یا بھرپہ بخی تاثر کی کیفیت میں نہ ڈھلا تو وہ ادھ کچرا ہے گا اور غزل میں یہ پھور صاف پکڑا جائے گا۔

محروم نے اس چیز کو قبول کیا۔ کم گوش اس کے لکھتے ہیں اور اس سے بھی کم چھپواتے ہیں۔ اس لیے اپنے منتخب کلام میں جہاں وہ اس نہم میں کامیاب ہوئے ہیں وہاں ان کے شعر بے پناہ ہیں۔ اور وہی غزل کی یادگار بندیوں کے نشان کے طور پر یاد رکھے جانے کے قابل ہیں۔

محروم سلطانپوری نے نظم اور گیت کے شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی: ”گائے جا پہیے گا تے جا“ اور ”کیا جانے مجھے کیا یاد آیا“ متعدد مشاعروں میں مقبول ہوئے۔ طب میں درست گاہ حاصل کی، طبیب تھے اور خاصے کامیاب طبیب کے پر فیر ڈیڈ احمد صدیقی کی وساطت سے علی گڑھ، اور جگر مراد آبادی کی وساطت سے بھی کی فلمی دنیا تک پہنچے۔ ۱۹۴۳ء میں فلم ”شاہ جہاں“ میں کے ایں ہمگل مرحوم، محروم سلطانپوری کے گیت اور غزلیں گارہے تھے۔ ”جب دل ہی ٹوٹ گیا“ رشید احمد صدیقی، جگر مراد آبادی اور ہمگل تینوں غزل کے دلدارہ بلکہ پرستار میگر بھی ترقی پندرہوں کا مرکز انقلابی محنت کشوں کا گھوارہ۔ اور اسی دورا ہے پر محروم کو غزل کا نیا آہنگ ملا۔

محروم عربی مدرس کے فارغ التحصیل ہیں، انگریزی نہیں جانتے مگر مارکسی نظریے تک ان کی رسانی ترقی پندرہ تحریک کی راہ سے ہوئی اور اس نظریاتی صداقت نے محروم کی غزل کو نئی آہنگی بخشی۔ مگر اس منزل تک پہنچنے سے پہلے بھی کئی منزلیں تھیں۔

محروم غزل میں کلاسیکی آئین و ادب کے قائل ہیں۔ نغمگی اور هرق سازی ان کا فن ہے اور اس کے لئے سازدبرگ دروایت کے سمجھی نقش دنگار سے حاصل کرتے ہیں۔ اسی نے سجادوٹ ان کی غزوں میں محض تراکیب یا تشبیہ سازی سے عبارت نہیں بلکہ سمجھیں پن اور الیکٹریک کا نام ہے۔ پہلے ایک نظر ان کی عشقیہ شاعری پر ڈال لیں۔ پہلے جمال کا ایک منظر:

اس نظر کے اٹھنے میں اس نظر کے جھکنے میں نغمہ سحر بھی ہے آہ صبح گاہی بھی

دُور دُور وہ مجھ سے اس طرح خراماں ہے ہر قدم ہے نقشِ دل ہرنگہ رگِ جمال ہے

میرے شکوہ غم سے عالمِ نذامت ہے اس لبِ تسم پر شمع سی فروزان ہے

جمالِ صبح دیاروںے نوبہ کار دیا مری نیگاہ بھی دیتا خُدا حسینوں کو

یہ سمجھی اشعار مرکب تصویروں سے عبارت ہیں۔ ان میں کہیں آلو دگی کا کوئی پرتو نہیں ہے۔ جمالیاتی انساط معرفتی انداز ہے، جہاں حسن کے اس جمالیاتی پیکر سے محروم تعلق قائم کرتے ہیں وہاں بھی ربو دگی کے باوجود ایک باوقار فاصلہ باقی رہتا ہے جو ان کی

غزل کو بنھائے رکھتا ہے، اور سرستی کے باوجود آلوہ نہیں ہونے دیتا۔

یہ نیازِ غم خواری، یہ شکستِ دل داری
بس نوازش جانا، دل بہت پریشان ہے
نگاہ یار کہتی ہے کوئی افسانہ برسوں سے
وہ بعدِ عرضِ طلب ہائے رے شوق جواب اپنا
کوہ خاموش تھے اور کتنی آوازیں نہیں میں نے
وہ لجاتے میرے سوال پر کہ اٹھا کے زُجھکا کسر
اڑی زلف چہرے پر اس طرح کشبوں کے رازِ مچل گئے
سرُجھکا ہے جو بھی اب ارباب میں خان کہیں
سرُجھکا ہے جو بھی اب ارباب میں خان کہیں

یہ تہذیبِ رسمِ عاشقی یہ باوقارِ سرثاری "محروم کی عشقیہ شاعری کی پہچان ہے۔ یہاں لذتِ پرستی اور ذاتِ اہم نہیں وقارِ حُسن اور جمال کی روشنی اہم ہے۔ یہ انسانی تعلقات کا ایک لطیف مرحلہ ہے جسے محروم مرقع ساز اشعار میں بیان کرتے ہیں۔

یہاں محروم کی غزل کی اس مرقع سازِ کیفیت کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے جو ان کی غزل کی پہچان بن گئی ہے۔ اس مرقع سازی کو وہ کبھی صرف بول چال کے لیجھے سے مکمل کرتے ہیں (بس نوازش جانا، دل بہت پریشان ہے یا سُرُجھکا ہے جو بھی اب ارباب میں خان کہیں) کبھی بے ساختہ کسی ایسے نظر کی تصویر کھینچ دیتے ہیں جو پڑھنے والے کو مصوری کا لطف دے جاتا ہے، مثلاً اڑی زلف چہرے پر اس طرح کشبوں کے رازِ مچل گئے — یا

بس پھیر کے من خارِ قدم کھینچ رہے تھے دیکھ تو نہاں قافیلہ ہم سفرال ہے
عشقیہ شاعری پر اس گفتگو سے واضح ہوا ہو گا کہ محروم بخی احساسات اور ذاتی تجربات کو بھی جہاں تک ممکن ہو آلوہ گی سے پاک کر کے محدودی انداز سے نظم کرنے کے قابل ہیں اور نظم کرنے کے سلسلے میں لفظوں اور حروف کے صوتی آہنگ کی جھنکار اور پرے درپے تصاویر کی مدد سے مرقع سازی اور لہجہ بندی ان کے اسلوب کی خصوصیات میں۔

ان خصوصیات کو محروم نے اپنی غیر عشقیہ شاعری میں بھی بڑی کامیابی سے برداشت کی۔ یہ کام آسان نہیں بخشی میڈیا میں کی رہو گی اور کیفیت آفرینی غیر عشقیہ میڈیا میں پیدا ہونی مشکل ہے۔ عام طور پر غیر عشقیہ میڈیا میں احساسات کو اس قدر گہرا ہی سے نہیں چھوٹے کر دل میں اتر جائیں اور احساس کا ایسا حصہ بن جائیں کہ شعر میں وارداتِ قلبی کے طور پر در آئیں۔ پھر اس قسم کے میڈیا میں خواہ وہ واقعات متعلق ہوں یا نظریات سے۔ قارئین اور شاعر کے درمیان عشقیہ میڈیا میں کی طرح مشترک نہیں ہوتے اور اسی لئے ان کے رد عمل اور ان سے پیدا ہونے والی کیفیات بھی یکساں طور پر قابل قبول نہیں ہوتیں۔ اسی لیے ان کا شعری اظہار بھی دشوار ہے۔ اور بھر اس شعری اظہار کی جایا تی ترسیل دشوار تر۔

آخر وہ کون سے تصوّرات اور کیفیات، میں جن کی ترسیل مجرد حکومت سلطانپوری کی غزوں کا امتیاز بنی ہے؟ سب سے پہلے حیات اور کائنات کے تسلیل کا احساس اور تاریخی قتوں کی کافرمانی کا تصور جسے مارکس کی مادی جدیت نے بڑی وضاحت سے پیش کیا۔ اس تصور نے انسانی زندگی اور سماج کو کسی ماورائی طاقت کی دین قرار دینے کے بجائے ایک مادی تسلیل اور ایک تاریخی ربط دے دیا۔ ظاہر ہے یہاں زندگی سے مراد الفرادی نہیں اجتماعی زندگی ہے جسے اقبال نے "ساقی نامہ" میں گلوں کو ایک شاخ سے ٹوٹتے رہنے اور اسی شاخ سے پھوٹتے رہنے سے تعبیر کیا تھا۔ مجرد حکومت انسانی زندگی کے مادی تسلیل کے مضمون کو جا بھبھی شعریت سے غزل میں نظم کیا ہے۔

مرے پیچھے یہ تو محال ہے کہ زمانہ گرم سفر نہ ہو
کہ نہیں مرا کوئی نقش پا جو چرا غ راہ گزرنہ ہو
ترے پاز میں پر رکے رکے ترا سر نلک پر جھکا جھکا
کوئی بجھ سے بھی ہے عظیم تر یہی اہم بجھ کو مگر نہ ہو
نہ دیکھیں دیر و حرم سوئے رہروان حیات
یہ قافلے تو نہ جانے کہ ساں قیام کریں
گنبدوں سے پڑی ہے اپنی ہی صدا مجرد حکومت
مسجدوں میں کی میں نے جا کے دادخواہی بھی
مرے عہد میں نہیں ہے یہ نشان سرپندری
یہ رنگ ہوئے عامے یہ جھکی جھکی کلا ہیں

دوسری مضمون عظمتِ انسان کا ہے جو تاریخی شعور سے پیدا ہوا ہے۔ یہاں پیش نظر یہ خیال ہے کہ انسان مادی حالات سے بندھا ہوا ہے مگر ان حالات کی حد بندگی میں رہ کر وہ اپنی تقدیر خود بنا بھی سکتا ہے اور تاریخی جدیت کے قانون کے مطابق مستقبل دبے کچلے محنت کش طبقوں اور ان کے حمایتوں ہی کا ہے۔ اہل اقتدار جبرا و استبداد کے کتنے بھی حریب کیوں نہ آزمائیں لیکن تاریخی قوتیں محنت کش کے حق میں ہیں اور ان کی فتح لازمی ہے، گواں فتح تک پہنچنے کا راستہ سخت اور دشوار گزار ہے۔ اور اس راہ کے مصائب بے شمار اور بے انتہا ہیں۔ لیکن جو اس راہ میں قدم رکھتے ہیں ان کی حق گولی اور پا مردی تاریخی قتوں سے ہم آہنگ ہونے کے سبب سے اجتماعی استناد حاصل کرتی ہے اور لوگ ساختہ آتے جاتے ہیں کارروائی بنا جاتا ہے اور اس راہ کے مصائب میں تاریخ کا شعور رکھنے والے اپنی کچ کلاہی قائم رکھتے ہیں۔ ان کے دکھ ہی ان کے راہ نہ ہیں۔ وہ حال کے انہیں میں بھی مستقبل کے اجلاء پر نظر جائے رکھتے ہیں۔ اب ان یعنی مفہای میں کو مجرد حکومت کی غزل کے آئینے میں دیکھئے:

ہم میں کعبہ ہم میں بُت خانہ ہیں میں کائنات
ہو سکے تو خود کو بھی اک بار سجدہ کیجئے
ساز اٹھایا جب وہ گرتے رہے ذرول کے دل
جام ہاتھ آیا تو مہرومہ کے ہسائے ہوئے
شمع بھی اجلا بھی میں ہی اپنی محفیں کا
میں ہی اپنی منزل کا راہبر بھی راہی بھی

آپ اپنا مقدر بن نے کے اتنا تو کوئی مجبور نہیں
یہ جہاں بھی بیٹھ جائیں وہیں ان کی بارگاہیں
انھیں ہم اہل تھت کے نقش پا کہیے
تجھ کو تو ابھی کچھ اور سیں اے عالمِ امکاں ہونا تھا
بتاؤ عالم بالا کے سیر بیوں کو

تقدیر کا شکوہ بے معنی جینا ہی بجھے منظور نہیں
ترے خانماں خرابوں کا نہ چمن کوئی نہ صمرا
یہ کوئے یاریہ زندگی یہ فرش یہ مے خانہ
ہر موڑ پر مل جاتے ہیں ابھی فردوس و جہاں کے شیدائی
یہی جہاں ہے جہنم یہی جہاں فردوس

(ب) تاریخی جدیت سے ہم آہنگ آواز اجتماعی آوازِ بن جاتی ہے :

میں اکیلا ہی چلا تھا جانپِ منزل مگر
لوگ ساختہ آتے گئے اور کارروائی بنتا گیا

یا زمیں پر یا سر افلاک میں چھائے ہوئے

ہے یہی اک کاروبارِ نقشہ و مسٹی کہ ہم

یا زمیں پر یا سر افلاک میں چھائے ہوئے

(ج) انسانی ارتقا مختکشوں ہی کامِ ہونِ منت ہے اور وہ زندگی کی برکتوں کے ستحق بھی ہیں اور وہی ان برکتوں کو انسانی زندگی میں عام کر سکیں گے ہے

وادیوں میں ناچیں گے ہر طرف ترانے سے
اب گُھر بُک ہو گا جو کے ایک دلنے سے
اب سور کے نکلے گا حسن کا رخانے سے
بھر سکیں گے اب دامن ہم بھی اس خزانے سے
صریح نو عبارت ہے میرے مُسکانے سے
کوئی دن اور میں رُسو اسِ ریا زار سہی
میں ترا دامِ خزان ! لا کھ گرفتار سہی

اب زین گائے گی ہل کے ساز پر نغمے ،
اہلِ دل اگائیں گے خاک سے مد و انجم
مَنْ چلے بنیں گے اب رنگِ دلوں کے پیرا ہن
عام ہو گا اب ہدم اسب پر فیضِ فطرت کا
میں کہ ایک مختک کش میں کہ تیرگی دشمن
دستِ منعم مری مختک کا خریدار سہی
پھر بھی کھلاؤں گا آوارہ گیسوئے بہار

(د) مختک طبقوں اور ان کے حمایتوں کو تاریخی جدیت کی اس راہ میں سختیوں اور ان سے حاصل ہونے والے دُکھ کو کچھ کلاہی اور بانپکن سے جھیلنا چاہیے کہ آخری فتح اُنہی کی ہے اور ظلم و تم ان کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ یہاں دُکھ اور قربانی نشاط ہے اور تکالیف ہی راحت کی امین ہیں ہے

اپنی کلاہ رکھ ہے اسی بانپکن کے ساتھ
گری کلاہ ہم پہنے ہی بانپکن میں رہے

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
بچوم دہر میں بدلتی نہم سے وضع خرام

اہل دل جام بکف سر بکفن جاتے ہیں
ہم تو آواز ہیں دیوار سے چھن جاتے ہیں
زخم کے مہر دماہ سلامت جتن چراغاں تم سے زیادہ
یہ نہ سمجھنا ہم کو ہولہے جان کا لقصاں تم سے زیادہ
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے سات چلے
جہاں تک یہ تم کی سیاہ رات چلے

اہو جتنا نہیں دیتا تو کیوں بدن میں رہے
قص کرنا ہے تو پھر یا اول کی زنجیر نہ دیکھ
وہ کون سی کالی راتیں ہیں جو میرے نشیں میں چور نہیں
چراغ راہ کیے خون چکاں جینوں کے
میں فراز دار سے دیکھ لوں کہیں کاروانِ محنت ہو
ہر وقت یہ کس کو ڈھونڈتے ہیں دیوار کے سائے زندگی میں
زخموں سے چراغ راہ گزر میٹھے میں جلاے زندگی میں
اس لمحے کی جھنکا کار پر غور کیجئے، یہاں درد مندی ہے، مایوسی نام کو نہیں اور درد اور دُکھ کی اس دل گدازی سے نئی توانائیاں
ڈھانے کا عزم ہے۔ اور یہ نئی حیثیت اور نئے انقلابی نظریے کے لیے شعور کو غزل کی رمزیت میں سحوں کا کمال ہے۔

غزل کو سیاسی رمزیت دینے کا یہ کام یوں توہہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ اقبال سہیل اپنی غزلوں میں سیاسی رمزیت کا استعمال برداشت کرتے آئے تھے۔ جگہ مراد آبادی نے اپنے آخر دو رکی غزلوں میں سیاسی رمزیت کو واضح طور پر اپنایا۔ خود ترقی پسند شاعر دل کی صفت میں جذبی نے سیاسی رمز دایا کو برداشت، البتہ مجرد اور فیض کے ہاں یہ رمزیت نئی بلندیوں تک پہنچی۔ دونوں کے ہاں اس کی نوعیت مختلف ہے۔ مجرد اور فیض کے ہاں یہ لے بنی۔ لی رندیوں سے اور تلنگانہ تحریک کے دوران ابھری اور ۱۹۶۲ء کے ہستہ چین مناقشہ تک تقریباً ختم ہو گئی (دو چار شعر اس کے بعد میں تو میں) اس دوران مجرد اور فیض کے بعد میں تو میں) اس دوران مجرد اور فیض کو جیل جانے کا بھرپور ہوا اور سر پر ہواۓ ظلم کے سو جتن کے ساتھ چلنے کا بھی، مگر فیض کے ہاں یہ بھرپور (اوہ نہایہ لمحہ) پوری زندگی بن گیا۔ اس لیے مجرد اور فیض دونوں

سوئے مقتل کپے سیر چمن جاتے ہیں
روک سکتا ہیں زندگی بلا کیا محشر وح
جاو تم اپنے بام کی خاطر ساری لویں شمعوں کی کتر لو
ہم بھی ہمیشہ قتل ہوئے اور تم نے بھی دیکھا دوڑ سے لیکن
جلاء کے مشعل جان ہم جنوں صفاتے چلے
ستون دار پر رکھتے چپلو سروں کے چراغ
یہی زخم نئی صبح کا سرمایہ ہیں اور یہی انقلابی کی شان :

سرشک رنگ نہ بخشے تو کیوں ہو بار مژہ
دیکھ زندگی سے پرے، رنگ چمن، جوش بہار
وہ کون سی صحیح ہیں جن میں بیدار نہیں افسوں تیرا
ہوئے ہیں قافلے ظلمت کی وادیوں میں رواں
شبِ ظلم زندہ را ہزن سے پکارتا ہے کوئی مجھے
 مجرم تھے جو ہم سو قید ہوئے صیاد مگر اب یہ تو بتا
ہو تیر اثر زنجیر قدم، پھر بھی ہیں نقیبِ منزل ہم

کے لیجے اور دونوں کی رمزیت کی نوعیت جدا گانہ ہے۔ ایک تخصیص کی طرف جاتا ہے اور دوسرا یعنی تخصیص کی طرف۔ ایک کے لیجے میں شکوہ ہے تو دسرے کے ہاں زمی اور دل بستگی۔ لہذا ان دونوں میں تقدیم و تاخیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دونوں کے لیجے اور دارِ حکماں جدا گانہ ہیں۔ دونوں دو الگ طرزِ فناں کے موجود ہیں اور شاید خاتم بھی۔

محروم کی زبان سے تحریک بول رہی تھی اور یہ وقار اور شکوہ سے بول رہی تھی۔ تحریک کمزور ہوئی تو محروم کا لہجہ بھی دھیما ہوا بعض اشعار پھر بھی کونڈے کی اپیک رکھتے تھے مگر تحریک کی گہرائی اور آگئی کی ہمہ گیری اور جامیت کا اعتماد نہ تھا۔ محروم بلاشبہ آج بھی غزل کے کلاسیکی لیجے کے مزاج داں ہیں۔ اور جس طرح وہ سجا کر اور سنوار کر غزل کہتے ہیں وہ انھیں کا حصہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان کی غزل کیا آج کے دھند لکوں والے دور کو بھی حوصلہ اور اعتماد کا وہی نورخش سکے گی جو وہ اس دور سے پہلے ارزانی کرتی آئی ہے۔ انھوں نے اس سجادوٹ اور نکھار کو لالاعداد تراکیب تراش کر اور نئی نغمگی سے بھر پور مرقعے مرتب کر کے بنھایا ہے اور ضربِ موسم، مطلعِ امکان، تیشہ نظر، سیلِ زنگ، مشعلِ جاں، شعلہ آوارہ، کلمہ سنگ بتاب، مرتقیلِ ظلمات، سنگِ سفر، پاس طرز نوا، فرازِ دار، ستونِ دار، خرام، شیشہ، نہ جانے کتنی دلفریب اور نظر نواز تراکیب محروم کی ایجاد ہیں۔ ان کے آرٹ کی جھنکا را اور ان کے مرقوں کی تصویر سازی کا جائزہ مستقل مقامے کا محتاج ہے لیکن ان تراکیب کی جاں فزانی کے پیچھے جس لیجے اور جس نظریے نے ان کی غزل کو تمہرہ داری اور جانفزانی بخشی ہے وہ غزل کے نئے مزاج کی بھی آئینہ داری کرتا ہے اور محروم کی غزل کی تاریخ ساز معنویت کی بھی۔

شمع بھی اجالا بھی میں ہی اپنی محفل کا

میں ہی اپنی منزل کا راہبر بھی راہی بھی

ڈاکٹر محمد حسن
بہ شکریہ "عصری ادب" دہلی

فِرْدَوْسِ کے نام



”مرے جنوں کی مہک تیرے پر ہن میں رہے“

بہت ہی کم ہے تو خالِ رُخ بہاراں ہے
مری نواکوٹی ہے وہ داغ پیر مہنی
سلے جو وقت نواجخی هزاراں چے
ادھر بھی دیکھ تماشا ہے میری کم سُختنی

ختم شورِ طوپاں تھا، دُورِ تھی سیاہی بھی،
دم کے دم میں افسانہ تھی مری تباہی بھی

التفات سمجھوں یا بے رُخی کہوں اس کو
رہ گئی خلیش بن کر اُس کی کم نہ کاہی بھی!

اس نظر کے اٹھنے میں اُس نظر کے بُچکنے میں
لغۂ سحر بھی ہے آہِ صُبح گاہی بھی

یاد کروہ دن جس دن تیری سخت گیری پر،
اشک بھر کے اٹھتی بھتی میری بے گناہی بھی

پستی زمیں سے ہے رفتہ فلک قائم
میری خستہ حالی سے تیری کچکلا، ہی بھی

شمع بھی اچالا بھی میں ہی اپنی محفیل کا!
میں ہی اپنی منزل کاراہب بھی را، ہی بھی

گنبدوں سے پٹی ہے اپنی، ہی صدائِ مجرور
مسجدوں میں کی میں نے جا کے دادخواہی بھی

مَسْرُّتُوں کو یہ آہل ہوس نہ کھو دیتے
جو ہر خوشی میں ترے غم کو بھی سہمو دیتے

کہاں وہ شب کہ ترے گیسوں کے سائے میں
خیالِ صبح سے ہم آئے میں بھگو دیتے

بہانے اور بھی ہوتے جو زندگی کے لیے
ہم ایک بار تری آرزو بھی کھو دیتے

پھالیا مجھے طوفاں کی موج نے ورنہ
کنارے والے سفیدِ سرہ مرا ڈبو دیتے

جو دیکھتے مری لڑکوں پیہ بندشوں کے ستم
تو یہ لٹا رے مری بے بسی پہ رو دیتے

بکھری تو یوں بھی اُنڈتے نہ شکنِ ہم مجرُوح
کہ میرے زخم تھما کے داغ دھو دیتے

دُور دُور مجھ سے وہ اس طرح خرماں ہے
ہر قدم ہے نشیشِ دل، ہر نگہ رُگِ جاں ہے

بن گئی ہے مستی میں دل کی بات ہنگامہ
قطرو تھی جو ساغر میں اب تک آکے طوفان ہے

ہم تو پائے جاناں پر کر بھی آئے اک سَجَدہ
سوچتی رہی دُنیا کُفر ہے کہ ایماں ہے

میرے شکوہ غم سے عالمِ ندامت ہے
اُس لبِ تبسم پر شمعِ سی فروزال ہے

یہ نیازِ غم خوار می، یہ شکستِ دلدار می
بس نوازشِ جانائِ دل پہت پریشاں ہے

مُنتظر ہیں پھر میرے کردارِ زمانے کے
پھر مرا چنول میری بزم میں غزلِ خواں ہے

فکر کیا اخیں چب تو ساتھ ہے اسیوں کے
اغمِ اسپیری تو خود شکستِ زندگی ہے

اپنی اپنی ہمت ہے، اپنا اپنا دل مجسر وح
زندگی بھی ارزش نہ موت بھی فراواں ہے

ہٹ کے روئے یار سے ترین عالم کر گئیں
وہ لگا ہیں جن کو اب تک رائے گال سمجھا تھا میں



دل سادہ نہ سمجھا، ما سوائے پاک دامانی
نگاہ یار کہتی ہے کوئی افسانہ برسوں سے

یہ رُکے رُکے سے آنسو یہ دبی دبی سی آہیں
لیو نہی کب تک خدا یا عزم زندگی نسبا ہیں

کہ میں ظلمتوں میں گھر کر ہے تلاشِ دست رہیں
کہ میں جگم کا اٹھی ہیں مرے نقش پا سے راہیں

ترے خانماں خراپوں کا چمن کوئی نہ صحرا
یہ جہاں بھی بلیٹھ جائیں وہیں ان کی بارگاہیں

کچھی جادۂ طلب سے جو پھر اہوں دل شکستہ
ترمی آرزو نے ہنس کرو ہیں ڈالدی ہیں باہیں

ہر سے عجہد میں نہیں ہے یہ نشان سر بلندی
یہ رنگے ہوئے غامے یہ جھکلی جھکلی کلا میں

آہ جاں سوز کی محرمو می تاشیر نہ دلکھی
ہو، ہی جائے گی کوئی جینے کی تدبیشیر نہ دلکھی

حادثے اور بھی گذرے ترمی الفت کے سوا
ہال مجھے دلکھ مجھے، اب مری تصویر نہ دلکھی

یہ ذرا دُور پہنچنل، یہ اچالا، یہ سُکون،
خواب کو دلکھ ابھی خواب کی تعسیر نہ دلکھی

وکیھ زندگی سے پرے رنگِ حمین، جوشِ بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دکھ

پچھو بھی ہوں پھر بھی دکھے دل کی صدائوں ناداں
ہیری بالوں کو سمجھ، تلمخی لفت سریر نہ دکھ

و، ہی مجرّح، و، ہی شاعر اوارہ مزان
کون اٹھا ہے ترمی بزم سے دلکش نہ دکھ

✓
ڈر کے مَوْج و تلاطم سے ہم نشینوں کو
مہی تو میں جو ڈبو پایا کیئے سَفینوں کو

شراب ہو، ہی گئی ہے بقدر پیمانہ
پُغَزِمِ ترک پخوارِ راجب آستینوں کو

جمالِ صبح دیا، رُوئے نوبہار دیا
مری نگاہ بھی دیتا خدا حسینوں کو

ہماری راہ میں آئے ہزار میخانے
بچھلا کے نہ مگر ہوش کے فترینوں کو

کبھی نظر بھی اٹھائی نہ سوئے باوہ ناب
کبھی چڑھا گئے پچھلا کے آبکمینوں کو

ہوئے ہیں قافلے ظلمت کی والوں میں رواں
چراغ راہ کیئے خُوں چکاں جس بیسوں کو

تجھے نہ مانے کوئی تجھ کو اس سے کیا محروم
چل اپنی راہ بھٹکنے دے نکتہ چیزوں کو



جب ہوا عرفان تو غم آرام جاں بنتا گیا
سوزِ جانماں دل میں سوز پر گیراں بنتا گیا

رفتہ رفتہ منتظر ہوتی گئی رسیمِ حمن
دھیرے دھیرے نعمتِ دل بھی فعال بنتا گیا

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزلِ مگر
لوگ سامنھا آتے گئے اور کارروائی بنتا گیا

میں توجہ جانوں کے بھروسے ساغرِ ہر خاص و عام
لیوں توجہ آیا وہی پسیرِ مُغاں بنتا گیا

جس طرف بھی چل پڑے ہم آپہ پایاں شوق
خار سے گل اور گل سے گلستان بنتا گیا

شرحِ غم تو مختصر ہوتی گئی اُس کے حضور
لفظِ جو مُنتہ سے نہ لکلا داستان بنتا گیا

دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضمون کہاں
میں جسے چھوٹا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

تقدیر کا شکوہ بے معنی، جلیٹا، ہی صحیح منظور نہیں
آپ اپنا مقدر بن نہ سکے، اتنا تو کوئی مجبور نہیں

یہ مخلل اہل دل ہے یہاں، ہم سب میکش، ہم سب ساقی!
تقریب کر دیں انسانوں میں اس بزم کا یہ دستور نہیں

جنت بہ نگہ، تینیم پہ لب، انداز اُس کے ای شیخ نہ پوچھ
میں جس سے محبت کرتا ہوں، انساں ہے خیالی حور نہیں

وہ کون سی صبحیں ہیں جن میں بیدار نہیں افسوں تیرا
وہ کون سی کالی راتیں ہیں جو میرے نشے میں پھونر نہیں

سُنٹے ہیں کہ کاشٹ سے گل تک ہیں راہ میں لاکھوں ویرانے
کہتا ہے مگر یہ غرام جنوں، صحراء سے گلستان دُور میں

محرومِ امُٹھی ہے موجِ صبا، آثار لیئے طوفانوں کے
ہر قطرہ شہنم بن جائے، اک بُجھے روای کچھ دُور، میں



آخر غم جانال کو اے دل، بڑھ کر غم دوراں ہونا تھا
اس قدرے کو بننا تھا دریا اس موج کو طوفاں ہونا تھا

ہر موڑ پہ مل جاتے ہیں ابھی فردوس و جہاں کے شیدائی
تجھ کو تو ابھی کچھ اور حسیں، اے عالمِ امکاں ہونا تھا

وہ جس کے گدایِ محنت سے پُر نور شبستان ہے تیرا
اے شوخ اسی بازو پہ ترمی زلفوں کو پرپیشان ہونا تھا

آتی، ہی ری ہے گلشن میں اب کے بھی بہار آئی ہے تو کیا
ہے یوں کہ قفس کے گوشوں سے اعلان بہاراں ہونا تھا

ایا ہے ہمارے ملک میں بھی اک دورِ لمحَّتِ اُنیٰ یعنی
اب وہ غم زندگی دیتے ہیں جن کو غم زندگی ہونا تھا

اب کھل کے کہوں گا ہر غمِ دل مجرورِ حنیف وہ وقت کہ جب
اشکوں میں سنا نا تھا مجھ کو آہوں میں غزلِ خواں ہونا تھا

نگاہِ ساتی نامہ رہاں یہ کیا جانے
کہ ٹوٹ جاتے ہیں خود دل کے ساتھ پہیاں نے

ملی جب اُن سے لظر بس رہا تھا ایک جہشائن
ہٹی نگاہ تو چاروں طرف تھے ویرانے

حیات لغزش پیغم کا نام ہے ساتی!
بُوں سے جام لگا بھی سکوں خُداجانے

تیسماں نے نکھارا ہے کچھ تو ساتی کے
پچھے اہلِ غم کے سلوارے ہوئے ہیں میخانے

یہ آگ اور نہیں، دل کی آگ ہے ناداں
چراغ ہو کہ نہ ہو جلن بھیں گے پروانے

فریب ساتیِ محفل، نہ پُوچھئے مجرِ سروح
ثراٹ ایک ہے، بدلتے ہوئے ہیں پیمانے

اب اہلِ ورديہ جبيئے کا اہتمام کريں
اُسے بھلاکے غشم زندگی کا نام کريں

فریب کھا کے اُن آنکھوں کا کپ تلک آدل،
شراب پی خام پئیں رقص ناتمام کريں

غمِ حیات نے آوارہ کر دیا ورنہ
تھی آرزو کہ ترے در پہ صبح و شام کريں

نہ مانگوں پادۂ گلگوں سے بھیک مستی کی
اگر ترے لب پر تعیین مرایہ کام کریں

نہ دیکھیں ذیر و حرم سوئے رہروانِ حیات
یہ قافلے تو نہ جانے کہاں قیام کریں

ہیں اس کشاکش پیغم میں زندگی کے فرنے
پھر ایک بار کوئی یہ سعی ناتمام کریں

سکھائیں دستِ طب کو ادائے بلیبا کی
پیام زیرِ بھی کو صدائے عام کریں

علام رہ پھکے، توڑ میں یہ بُندِ رسوائی
پچھا اپنے بازوئے محنت کا احترام کریں

ز میں کوہل کے سواریں مثالِ روئے نگار
رنگ نگار سے روشن چسرا غ بام کریں

پھر اٹھ کے گرم کریں کاروبارِ لف و چنون
پھر اپنے ساتھ اُسے مجھی اسپرِ دام کریں

مری لگاہ میں ہے ارضِ ماں کو، مجرّوح
وہ سر زمیں کہ ستارے چھے سلام کریں

مَهْ وَخُور شِيد بَحْلَى سَاعِر بَكْفَ هَوْ كَرْ أَتْرَ آعَ
بُوقْتِ بَادَهْ نُوشِي جَبْ نَجُورِي آسْتِينْ مِينْ نَهْ

وَهْ بَعْدِ عَرْضِ مَطْلَبْ بَاءَرَ رَهْ شَوْقِ جَوَابْ أَپَنَا
كَهْ خَامُوشْ تَحْهَهْ أَوْ كَلْتَنِي آوازِينْ سَنِينْ مِينْ نَهْ

دستِ مُشتم مرمی محنت کا خریدار ہی
کوئی دن اور میں رسوائسر بازار ہی

پھر بھی کہلاؤں گا آوارہ گیسوئے ہیما
میں ترا دام خزان لاکھ گفتار ہی

جست کرتا ہوں تو لڑ جاتی ہی منزل سے نظر
حائل را کوئی اور بھی دیوار ہی

نیھر تِ سنگ ہے ساقی یہ گلوئے لشنه
تیر کے پیمانے میں چومونج ہے ملوار ہی،

میں نے دیکھی ہی اُسی میں غمِ دوآل کی جملک
پے خبر زنگِ چہاں سے نگہِ یار ہی،

اُن سے پچھرے ہوئے مجرموں زمانہ گذرا
اپنے بھی ہوتوں میں وہی گرمیِ خسار ہی،

✓

کوئی آتش در سُبو شعلہ بے جام آہی گیا
آفتاب آہی گیا، مَاهِ تیر مام آہی گیا

مُختسب! ساقی کی حپشہ نہیں دا کو کیا کروں
میکدے کا درکھلاگر دش میں جام آہی گیا

اک تِمگر تو کہ وجہِ صدر خرابی تیرا درد
اک بلا کش بیں کہ تیرا درد کام آہی گیا

ہم نفس! صیاد کی رسم زبان بندی کی خیر
بے زبانوں کو بھی اندازِ کلام آہی گیا

آخرش مجرّح کے بے رنگ روز و شب میں وہ
صیح عارض پر لئے زلفوں کی شام آہی گیا

جلوہ گل کا سبب دیدہ تر ہے کہ نہیں
میری آہوں سے بہاراں کی سحر ہے کہ نہیں

راہ گم کر دہ ہوں کچھ اُس کو خبر ہے کہ نہیں
اُس کی پلکوں پہ ستاروں کا گذر ہے کہ نہیں

دل سے طتی تو ہے اک راہ، میں سے اگر
سوچت ہوں یہ ترمی راہ گذر ہے کہ نہیں

تیر ہو دستِ ستم دے بھی شراب اے ساتی
تع گردن پہ سی، جام سپر ہے کہ نہیں

میں جو کہتا تھا سو اے رب سر کوتاہ خرام
تیر میں نزل بھی مری گرد سفر ہے کہ نہیں

اہ لقدر! یہ ہے مجھ رہ دستِ عمل
جو خرف میں نے اٹھایا وہ گہر ہے کہ، میں

دیکھ کلیوں کا چٹکنا، سر گلشن صیاد
زمزمہ سخ مر انون جگر ہے کہ نہیں،

ہم روایات کے مُسنکر نہیں، لیکن مجرّوح
سب کی اور سب سے جُدًا اپنی ڈگر ہے کہ نہیں



مجھے نہیں کسی اسلوبِ شاعری کی تلاش
تری زگاہ کا جادو مرے سخن میں رہئے



ترے سوا مجھی کہیں حتیٰ پناہ مجھوں گئے
نکل کے ہم تری محل سے راہ مجھوں گئے

مجھے سہل ہو گئیں منزِ لیں وہ ہوا کر خبھی بدل گئے
مرا ہاتھ، ہاتھ میں آگیا کہ چڑاغ راہ میں جل گئے

وہ لجائے میرے سوال پر کہ اٹھا سکے نہ چھکا کے سر
اڑی زلف چہرے پر اس طرح کہ شبوں کے رازِ محل گئے

وہی بات جونہ وہ کہہ کے مرے شعر و نغمہ میں آگئی
وہی لب نہیں جنخیں پچوسکا قدرِ ثراہ میں دھل گئے

وہی آسماں ہے وہی جپیں وہی اشکن ہے وہی آستینیں
دل زار تو بھی پُدل کہیں کہ جہاں کے طور پُدل گئے

بُجھے پچشمِ مست پچھہ بھی ہے کہ شبابِ گرمی بزم ہے
بُجھے پچشمِ مست خبر بھی ہے کہ سب آنکھیں بچھل گئے

مرے کام آگئیں آخرش یہی کاوشیں مہی گردشیں!
پڑھیں اس قدر مری منز لیں کہ قدم کے خار نکل گئے

جو سمجھاتے بھی اگر واعظِ برہم تو کیا کرتے
ہم اس دُنیا کے آگے اُس جہاں کا عالم تو کیا کرتے

حرم سے میکدست تک منزل یک عمر بھتی ساتی!
سہاراً گرنہ دیتی لغزشیں پیغم تو کیا کرتے

جو ہٹی کو مزاجِ گل عطا کر دیں وہ اے واعظ
زمیں سے دور فکرِ جنت آدم تو کیا کرتے

سوال اُن کا جواب اُن کا سکوت اُن کا خطاب اُن کا
ہم اُن کی اجنب میں سرناہ کرتے ہم تو کیا کرتے

چھاں مجروح دل کے حوصلے ٹوپیں زگاہوں سے
وہاں کرتے بھی مرگِ شوق کا ماتم تو کیا کرتے

اُنہل کے میداں میں دو رخی کے خانے سے
کام چل نہیں سکتا اب کسی بہانے سے

عہدِ افتتاب آیا، دورِ افتتاب آیا
مُنتظر تھیں یہ آنکھیں جس کی اک زمانے سے

اب زمین گائے گی، ہل کے ساز پر نغمے.
وادیوں میں ناچپیں گے ہر طرف ترانے سے

اہلِ دلِ آگائیں گے خاک سے مہم و انجام
اب کہر سبک ہو گا، جو کے ایک داتے سے

مئھلے پہنیں گے اب رنگ و بو کے تپیراں
اب سور کے نکالے گا، حسن کارخانے سے

عام ہو گا اب ہدم سب پہ فیض فطرت کا
مجھ سکیں گے اب دامن ہم بھی اس خزانے سے

میں کہ ایک محنت کش، میں کہ تپیرگی دشمن
صیحِ نوع عبارت ہے، میرے مسکرانے سے

خودکشی، ہی راس آئی، دمکھ پذپیوں کو!
خود سے بھی گریز ایں بھاگ کر زمانے سے

اب جنوں پہ وہ ساعت آپڑی کہ اے مجروح
آن زخم سر بہتر، دل پہ چوت کھانے سے

نُظَارَهٗ ہائے دُھر بہت خوب یہیں مگر
اپنا لہو بھی سُرخِ شام و سحر میں ہے



میں چہاں ہے جہنم، میں چہاں فردوس
بِتاؤ عالم بالا کے سیر پیوں کو

وُشمن کی دوستی ہے اب اہلِ وطن کے ساتھ
ہے اب خراں چمن میں نئے پیر ہن کے ساتھ

سر پر ہواۓ ظلم چلے، سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اُسی بانکین کے ساتھ

کس نے کہا کہ ٹوٹ گیا خنجیر فرنگ،
سینے پہ زخم تو بھی ہے دارِ کہن کے ساتھ

چھونکے جوگ رہے ہیں نیم بہار کے
جنپش میں ہے نفس بھی اسی پر چمن کے ساتھ

مجرّح قافلے کی مرے داستاں یہ ہے
 رہبر نے مل کے لوٹ لیا راہرن کے ساتھ

جُنونِ دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیر ہیں تھے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

مگر اے ہم نفس، کہتی ہے سوریدہ سرمی اپنی
یہ سرم قید و زندگی، ایک دیوار کیں تک ہے

کہاں بچ کر حلی افضل گل، مجھ آبلہ پا سے
ہرے قدموں کی گلکاری بیا پا سے چمن تھے

میں کیا کیا جُر عَنْهُ خُوں پی گیا پیمانہ دل سے
پلانو شی مری کیا اک مئے ساغر ششکن تک ہے

نہ آخر کہہ سکا اُس سے ہر حالِ دلِ سوراں
مہم تباہ کہ چو اُس کا شر کیا اجمن تک ہے

تو اہے جاوواں مجرِ وح جس میں روح ساعت ہو
محہا کس نے مران غمہ زمانے کے چلن تک ہے

✓

اہل طوفان آؤ، دل والوں کا افسانہ کہیں
مُونج کو گیسو، بھنور کو پشم جاتانہ کہیں

دار پر چڑھ کر لگائیں نعرہ رُلفِ صنم
سب ہمیں پاہوش سمجھیں چاہے دیوانہ کہیں

وہ شےٰ خوبیں کدھر ہے، پھر چلیں اُسکے حضور،
زندگی کو دل کہیں اور دل کو زدرانہ کہیں

غزل — ۴۰

تھا میں اُس بُت کی سکلائی اور کہیں اسکو جُننوں
چوم لیں مٹتہ اور اسے اندازِ زندانہ کہیں

سرخی مے کم تھی میں نے چھو لئے ساقی کے ہونٹ
سر جھکلا ہے جو بھی اب اربابِ میجانہ کہیں

تشنگی، ہی تشنگی ہے کس کو کہیئے میں کدھ
لب، ہی لب، ہم نے تو دیکھے کس کو پیمانہ کہیں

پارہ دل ہے وطن کی سر زمین مشکل یہ ہے
شہر کو ویراں کہیں یا دل کو ویرانہ کہیں

اے رُخِ زیبا پتاوے اور ابھی ہم کب تملک
تیسرگی کو شمع، تنهائی کو پروانہ کہیں

اَرْزُو، ہی رہ گئی مجرِ وح کہتے ہم بھی
اک غَزلِ ایسی جسے تصویرِ جانانہ کہیں

پاکبازی میں ہیں نورِ عَرَضِ لالہِ رُخَّاں
ہیں سیہ کاری میں کھلی نرگسِ مَتَانَةٌ ہمُّ

وہ جس پتھیں شمع سر زہ کا گماں ہے
وہ مشعلہ آوارہ ہمساری ہی زبال ہے

اب ہاتھ ہمارے ہے عنان خرش جنون کی
اب سر پپہ ہمارے کلہ سنگ بیتاں ہے

بس پھیر کے مُنه خار قدم کھینچ رہے تھے
دکھا تو نہ سال قافلہ ہمسفال ہے

چُبھتے ہی بُنی خار صفت پائے خرزال میں
کیا کیجے بہت ہم کو شہم لالہ رخاں ہے

کام آئے بہت لوگ سرِ مقتلِ طہمات،
اے روشنی کوچھے ولدار کہاں ہے

اے فصلِ جنوب ہم کو پئے مشغل گریباں
پیوند ہی کافی ہے اگر جامنے گراں ہے

محروم کہاں سے گھر گنڈم و جواہیں،
اپنی تو گرد میں یہی چشم نیگراں ہے

✓

مرے پیچھے یہ تو محال ہے کہ زمانہ گرم سفر نہ ہو
کہ نہیں مر آکر بی نقصش پا، جو پس رانغ راہ گذر نہ ہو

رُخِّیت سے جونہ ہو کبھی سحرِ ایسی کوئی نہیں مری
نہیں ایسی ایک بھی شام جو تہ زلفِ دار بسر نہ ہو

مرے ہاتھ ہیں تو بنوں گا خود میں اب اپنا سافِ میکدہ
خُم غمیز سے تو خدا کرے لیں جسم بھی مر اتر نہ ہو

میں ہزار شکل بدل چکا، چمن جہاں میں سُن اے صبَّا
کہ جو پھول ہے ترے ہاتھ میں یہ مراہی لختِ جگرنہ ہو

جنخیں سب سمجھتے ہیں مہرومه نہوں صرف چند لفڑو شِ پا!
جسے کہتے ہیں کرۂ زمین، فقط ایک سنگ سفر نہ ہو

ترے پاز میں پہ رکے رُکے، ترا سر فالک پہ جھکا جھکا
کوئی تجھ سے بھی ہے عظیم تر، بھی وہم تجھ کو مگرنہ ہو

شبِ ظلم نرغش راہن سے پُکارتا ہے کوئی مجھے
میں فرازِ دار سی دیکھ لؤں کہ میں کاروانِ سحر نہ ہو

میں شوُر جنوں ہے کہ جس چمن میں رہے
لگاہ بن کے حسینوں کی ان چمن میں رہے

تو اے پہار گریز اس کسی چمن میں رہے
مرے جنوں کی مہک تیرے پیر ہن میں رہے

نہ ہم نفس میں رکے مثل بوئے گل حصیاد
نہ ہم مثالِ حبِ حلقة رسن میں رہے

کھلے جو ہم تو کسی شوخ کی نظر میں کھلے
ہو سے گرہ تو کسی زلف کی شکن میں رہے

بُر شکرِ زنگ نہ بخشے تو کیوں ہو بارہڑہ
لہو جتنا نہیں بننا تو کیوں بدن میں رہے

بُجھوم دھرمیں بدلتا نہ ہم سے وضع خرام
گری کلاہ ہم اپنے ہی انکپن میں رہے

یہ حکم ہے رہے مٹھی میں بند سیل نہیں
یہ خدہ ہے محترپاں کوزہ کہن میں رہے

زبال ہماری نہ سمجھا یہ سان کوئی مجرم
ہم اجنبی کی طرح اپنے ہی وطن میں رہے

۱۷۔ مسٹر ڈیکٹنیٹ فاؤنڈیشن (مسٹر ڈیکٹنیٹ فاؤنڈیشن)

غزل ۷۰

ہر چیز پس من شوخ کو کیا ہوا، نہیں ہوتی آج حاریف دل
مرے زخم عشق کی خیڑھ ہو یہ کسے نظر سے گرا دیا

شبِ انتظار کی کشمکش میں نہ پوچھ کیسے سحر ہوئی
بھی اک پر لاغ بجھا دیا بھی اک پر لاغ جلا دیا

✓

ہم میں متار کوچہ و بازار کی طرح
اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

اس کوئے شنگی میں بہت ہے کہ ایک جام
باتھ آگیا ہے دولت بیدار کی طرح

وہ تو کہیں ہے اور مگر دل کے آس پاس
پھرتی ہے کوئی شے نگہ یار کی طرح

سیدھی ہے راہِ شوق پہ یوں ہی کہیں کہیں
ثُم ہو گئی ہے گیسوئے دلدار کی طرح

بے تیرش نظر نہ چلو راہِ رفتگاں،
ہر نقش پا بلند ہے دیوار کی طرح

اب جا کے کچھ کھلا ہنسہ ناخن جنون
زخم جگر ہوئے لب و خسار کی طرح

محروم لکھ رہے ہیں وہ اہل وفا کا نام
ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہگار کی طرح

سُوئے مقتول کہ پئے سیر ہمپن جاتے ہیں
اہل دل جام بکف سر بکفن جاتے ہیں

اگئی فصل جنون کچھ تو کرو دیوانو
ابر صحڈا لی طرف سایہ فگن جاتے ہیں

اُس کو دیکھا نہیں تم نے کہ میں ہی کو چھٹے و راہ
شارخ گل شو خی رفتار سے بن جاتے ہیں

وہ اگر بات نہ پوچھے تو کریں کیا ہم بھی
آپ ہی روٹھتے ہیں آپ ہی من جاتے ہیں

بلبُلو، اپنی نوازیض ہے ان انگلھوں کا
جن سے ہم سیکھنے اندازِ سُخن جاتے ہیں

جو ٹھہر تی تو ذرا چلتے صبا کے ہمراہ
یوں بھی ہم روز کہ سال سوئے چین جاتے ہیں

لُٹ گیں قافلہ اہل جہوں مجھی شاید
لوگ ہاتھیں میں لیئے مار رسن جاتے ہیں

روک سکتا ہمیں زندان بلا کیا مجرموں
ہم تو آواز ہیں دیوار سے چھپن جاتے ہیں

چمن میں آتشِ گل پھر سے مجھ کا نے بھی آئیں گے
خزاں آئی تو اب صحر سے دیوانے بھی آئیں گے

اگ بیٹھے ہیں پھر بھی آنکھ ساقی کی پڑی ہسپ پر
اگر ہے تشنگی کامل تو پیمانے بھی آئیں گے

ہندوستان کا دروازہ

عوامی چین کی طرف

کھلتے دیکھ کر

اہی جائے گی سحر، مطلعِ امکان تو کھلا
نہ سہی بابِ قفس، روزِ زندگی تو کھلا

لے کے آئی توصیب اُس گلِ چینی کا پیام
وہ سہی زخم کی صورتِ لبِ خندان تو کھلا

سیلِ رنگ آہی رہے گا، مگر اے کشتِ چمن
خربِ موسم تو پڑھی بندِ بہاراں تو کھلا

دلِ تلک پہنچنے نہ پہنچے، مگر اے چشمِ حیات
بعدِ تدت کے تراپیخے مژگاں تو کھلا

”درد کا درد سے رشته ہے“ چلو اے مجروح
آج یاروں سے یہ اک غصہ آسال تو کھلا

چین گی پیاں شگنی کے نام

وستِ پُرخُون کو کفِ وستِ نگاراں سمجھئے
قتلکہ تھی جسے ہمِ محفیلِ باراں سمجھئے

پچھے بھی دامن میں نہیں خارِ ملامت کے سوا
اے جنوں ہم بھی کسے کوئے بہاراں سمجھئے

ٹوٹے دھاگے ہی سے کرتے ہیں روچاں جگر
کون بے چارگی سینہ فگاراں سمجھئے

ہاں وہ بیپرو تو پیگانہ، ہی اچھا یارو
جو نہ تو قبیلہ عنہم درد گُرالاں سمجھے

خُندہ زن اُس پر رہے حلقوہ زنجیر جتوں
جو نہ کچھ مہنگا سلسلہ دارالاں سمجھے

اُج سے ہم نے بھی زخموں کو تباہم جانا
رزم کو بزم گہ لالہ عَذارالاں سمجھے

توڑ دیں ہسَم جو نہ ملوار تو کہیے مجرِ وح
یقِ زن کیا ہُنرِ زخم شعاراں سمجھے

✓

ادائے طولِ سُخن کیا وہ اختیار کرے
جو عرضِ حال بطریز نگاہ یا رکرے

بہت اسی میلخ نوا ہوں، مگر عَزِیز وطن
میں کیا کروں جو ترا دردِ مقیر کرے

ق

قدم کو فیضِ جنوں سے ود آبلہ ہے نصیب
جو خاکِ راہ کو بھی شیع رہنڈا رکرے

جگائیں ہمسفروں کو اٹھائیں پرچسِ شوق
نہ چانے کب ہو سحر، کون انتظار کرے

مثالِ ملتی ہے کتنوں کی اُس دوانے سے
چمن سے دُور چو بیٹھا غم بہار کرے

دیارِ جوڑ میں رستہ ہے اک میہی ورنہ
کسے پسند ہے اے دل کہ سیرِ دار کرے

خدا کرے غمِ گستی کا پیچ و تاب اے دوست
کچھ اور بھی ترمی زلفوں کو تا بدَار کرے

ستم : کیتھے قلم دیں اُسے جو اے مجروح
غزل کو قتل کرئے نفعے کوشکار کرے

گلوں سے بھی نہ ہوا جو مرا پستہ دیتے
صب اڑاتی پھری خاک آشیانے کی

جخاکے ذکر پہ تم کیوں سنبھل کے بلیچھ گئے
تمھاری بات نہیں بات ہے زمانے کی

✓

ہم کو جنوں کیا سکھلاتے ہو ہم تھے پریشان تم سے زیادہ
چاک کیے ہیں ہم نے عزیز و چار گریباں تم سے زیادہ

چاک جگر محنت اج رفو ہے آج تو دامن صرف ہو ہے
اک موسم تھا ہم کو رہا ہے شوق بہاراں تم سے زیادہ

عہد و فیاروں سے نجھائیں نازِ حریقان، ننس کے اٹھائیں
جب ہیں ارمائتم سے سوا تھا اب ہیں پریشان تم سے زیادہ

ہم بھی ہجیشہ قتل ہوئے اور تم نے بھی دیکھا دُور سے لیکن
یہ نہ سمجھنا ہم کو ہوا ہے، جان کا نقصال تم سے زیادہ

جاو تم اپنے بام کی خاطر ساری لویں شمعوں کی کستہ رلو،
زخم کے مہرو ماہِ سلامتِ جشنِ پراغاں تم سے زیادہ

دیکھ کے الجھنِ زلفِ دوتاکی کیسے الجھ پڑتے ہیں ہوا سے
ہم سے یکھو ہم کو ہے یار و فکرِ نگاراں، تم سے زیادہ

زنہر و دیوار ہی دیکھی تم نے تو مجسر وح، مگر ہم
کوچہ کوچہ دیکھ رہے ہیں، عالم زندان تم سے زیادہ

چمن ہے مقتولِ نغمہ اب اور کیا کہیئے
بس اک سکوت کا عالم جسے تو اکھیئے

اسی پر بندِ زمانہ ہوں صاحبانِ چمن
مری طرف سے گلوں کو بہت دعا کہیئے

میہی ہے جی میں کہ وہ رفتہ تغافل و ناز
کہیں لے تو وہی قصہ دف کہیئے

اُسے بھی کیوں نہ پھرا پسے دلِ زلُوں کی طرح
خَرَابِ کا گل و آوارہ ادا کہئے

یہ کوئے یار یہ زندگی فرشِ میجانہ
انھیں ہم اہلِ تمثَّل کے نقشِ پا کہئے

وہ ایک بات ہے کہیے طُوعِ صَحِیحِ نشاط
کہ تاشِ بدُن و شعلہِ حُنا کہئے

وہ ایک حرف ہے کہیے اُسے حکایتِ زلف،
کہ مشکوہِ رُس و بندشِ بلا کہئے

رہے نہ آنکھ تو کیوں دیکھئے ستمگی طرف
کٹے زبان تو کیوں حرفِ ناسزا کیئے

پُکارئے کف قاتل کو اب معالج دل
بڑھے جو ناخن خنجر گرد کش کیئے

پڑے جو سنگ تو کیئے اُسے نوالہ فرز
لگے جوز خسم بدن پر اُسے قبایل کیئے

فانہ جبیر کا یاروں کی طرح کیوں مجرموں
مزد تو جبٹ ہے کہ جو کیئے برملا کیئے

دل کی تمست تھی مسٹی میں، منزد سے بھی دُور نکلتے
اپنا بھی کوئی ساختی ہوتا، ہم بھی بہکتے، چلتے چلتے

بَلَكَ كَمْشُعِلِ جَاهِ هَمْ جَنُوْلِ صَفَاتٍ، چَلَيْ
 جَوَّهْرَ كَوَّاگَ لَگَائِيْهَ هَمَارَ سَاتٍ چَلَيْ

 دِيَارِ شَامِ نَهِيْنَ، مَنْزِلِ سَبْحَانِ نَهِيْنَ
 عَجَبَ نَكْرَهَ هَيْهَا دِنَ چَلَيْ نَهَ رَاتٍ چَلَيْ

 هُوا اَسِيرَ كَوَئِيْ هَمْنَوَا تو دُورَتِلَكَ ٹُوْ!
 پَيَاسِ طَرَزِ زَوَا هَمْ بَھَى سَاتِھَسَاتٍ چَلَيْ

ہمارے لب نہ سہی وہ دہانِ زخم سہی:
وہیں پھوٹتی ہے یار و کہیں سے بات چلے

ستونِ دار پر رکھتے چلو سردوں کے حیران
جہاں تک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

پھاک کے لائے ہم اے یار پھر بھی نقدوں
اگر چہ لڑتے ہوئے رہڑنوں کے ہات چلے

پھر آئی فصل کہ مانسِ برگ آوارہ
ہمارے نام گلوں کے مراسلات چلے

قطارِ شیشه ہے یا کاروانِ ہمسُر فال
خراجم جام ہے یا جیسے کائنات چلے

بلاہی بٹھچے جب اہل حرم تو اے مجروح
بغل میں ہم بھی لیئے اک صنم کا ہات چلے

وہ آرہے ہیں سنجھل سنجھل کر نظارہ بخود فضاجوال ہے
جُھکی جُھکی ہیں نشیلی آنکھیں رکارکا در در آسمان ہے



ہم ہی کعیہ ہم ہی بُت خانہ، ہمی ہیں کائنات مٹ
ہو سکے تو خود کو بھی اک پار سجد امکجھے

✓

ہوں جو سارے دست و پا ہیں خُول میں نہ لٹائے ہوئے
ہم بھی ہیں اے دل بہاراں کی قسم کھائے ہوئے

خبط ہے اے ہمنشیں عقتلِ خریفان بہار
ہے خزاں ان کی انھیں آئینہ دکھلائے ہوئے

کیا ہے ذکرِ آتش و آهن کے غداران گل:
مارتے میں ہاتھ انگاروں پچھرائے ہوئے

زندگی کی وقت سیکھی، شکریہ میغستم
اں ہیں تھے کل تک جنینے سے اکتا ہوئے

پھر ساحل کر چکے اے موچ ساحل سرناہ مار
جھسے کیا۔ ہیں گے طوفانوں کے بہلائے ہوئے

ہے مبھی اک کار و پار لغمٹ و مستی کہ ہم
پاڑ میں پڑیا سر افلاک میں پچھائے ہوئے

ساز اٹھایا جب لوگ راتے پھرے ذروں کے دل
جام باٹھ آیا تو مہرومہ کے بھائے ہوئے

رُشت و در ہٹنے کو ہیں مجسروح میڈاں بھار
اُرائی ہے نصلی گل پر حسَم کو لہرائے ہوئے

اب سوچتے ہیں لائیں گے تجھ سا کہاں سے ہم
انٹھنے کو اٹھ تو آئے ترے آستھاں سے ہم

اشکوں میں رنگ و بوئے چمن دُور تک ملے
جس دم اسیہر ہو کے چلے گلستان سے ہم

جسم یہ سنا ہے صح وطن مجوس فضاۓ زندگی میں
جیسے کہ صبا اے ہم قسوٰ بیاب ہم آئے زندگی میں

ہو یعنی اثر زنجیر قدم پھر بھی ہیں نصیبِ منزہِ حشم
زمخوں سے چڑاغ را دگزر بیٹھے ہیں جلاۓ زندگی میں

صد چاک قبائے امن و سکون عربیاں ہے انسانی کا جنون
چھوٹوں سے شہیدوں نے اپنے وہ گل ہیں کھلاۓ زندگی میں

غزل — ۱۰۰

+

یہ بھیر سیاست یہ انس مظلوم آہیں، مجبو فغان
زخموں کی تھک داغنوں کا دھوان هست پوچھ فضائے زندگیں

غیر کی خلش، اپنوں کی لگن سور غشم جانا، درد وطن
کیا کہیے کہ ہم ہیں کس کو سینے سے لگائے زندگیں

گل ٹتی ہے شاید خاک وطن، شاید کہ سفر کرتی ہے خزان
خوشبوئے بہاراں طلتی ہے کچھ دن سے ہوائے زندگیں
ق

مجرم تھے جو ہم سو قید ہوئے حصیاً دمکراپ یہ تو بتا
ہر وقت یہ کس کو دھونڈتے ہیں دیوار کے سائے زندگیں

چسموں پچھیہ کس کا نام سیمہ لکھ دیتے ہیں کوڑوں کے نشان،
ہیں تاک میں کس کی زندگیری اب انگلھ لگائے زندال میں

رفتارِ زمانہ کے جن کی گیتی ہے گلِ نعمت جن کا؛
ہم گاتے ہیں ان آوازوں سے آوازِ ملائے زندال میں

پچھے بہتا تو ہی نشیمن کا پستہ
میں تو اے بادِ صب بھول گیا

نذرِ سوویتِ لیوین

شیع زندال، مجھے ہر گلبَ دن سُرخ ترا
میں تو دیوانہ ہوں، اے اجمن سُرخ ترا

ہوں میں آکو دہ ہوں، پھر بھی مر اشوق تو دیکھو،
اب مرے تن پا بھی ہے پیر ہن سُرخ ترا

تو بھی دیکھے تو یہ اب ہونہ کے گا معلوم
میرے سینے میں ہے دل یا اطن سُرخ ترا

مقطع کے بعد



سیاہیاں شبِ فرقت کی ہم نفسِ مہت پوچھ
کسی کو یاد چون مجھ سے تو یاد آنہ سکے

بڑھائی مئے جو محبت سے آج ساقی نے
کہ کانپے ہاتھ کہ ساغر بھی ہم اٹھانہ سکے

اس طرح سے کچھ رات کو ٹوٹے ہیں ستارے
جیسے وہ ترمی لغزش پا دیکھ رہے ہیں



نہ میٹ سکیں گی یہ تنہ سائیاں مگر اے دوست
جو تو بھی ہو تو طبیعہ ڈراہیل جائے



اللہ رے وہ غلامِ خصوت کے دریتک
تھت رہا ہوں یوں ہی ترمی رہ گذر کو ہیں
یہ شوق کامیاب یہ تم، یہ فنت، یہ راست،
کہد تو آج روک دوں بڑھ کر سحر کو ہیں

گو خاکِ شمین پر اب بھی ہیں گر ریہ کُناں اربابِ حمین
جب برقِ ترڑپ کر ٹوٹی تھی اُس وقت کا عالم کیا ہو گا



مجھے یہ فکر سب کی پیاس اپنی پیاس ہے ساتی
تجھے یہ فساد کہ خالی ہے مرا پتھر میانہ برسوں سے

گورات مری صح کی محرم تو نہیں ہے
سورج سے ترا رنگِ حِنّا کم تو نہیں ہے
کچھُ زخم ہی کھائیں چلو کچھُ گلُ ہی کھلائیں
ہر چند بہاراں کا یہ موسم تو نہیں ہے
چاہے وہ کسی کا ہو لہو دامن گلُ پر
صیاد یہ ہل رات کی شینم تو نہیں ہے

اتی بھی تھیں بندش غم کب تھی گوا را
پر دے میں تری کا کل پر خم تو نہیں ہے
اب کارگہ دہر میں لگتا سب سے پست دل
اے دوست کھیں یہ بھی ترا عالم تو نہیں ہے
صحرائیں بگولا بھی ہے مجررو جھبایی
ہم کوئی آوارہ عالم تو نہیں ہے

بنامِ کوچھ دلدار گل برسے کے سنگ آئے
ہنسا ہے چاک پر اہن نہ کیوں جھرے پر زنگ آئے
بچاتے کپھرتے آخر کب تک دستِ عزیزاں سے
اُنھیں کوسونپ کر ہم تو کلا و نام و ننگ آئے
ہنسومت اہلِ دل اپنی سی جانو بزم خوبال میں
چلے آئے ادھر ہم کبھی بہت جب دل سے ننگ آئے

کہاں صحنِ حمّن میں بات کوئے سرفوشان کی
ادھر سے سادہ روپ پہنچے اُدھر سے لالہ رنگ آئے
کرو جس روح تب دار و رسن کے تذکرے ہم سے
جب اُس قامت کے سائے میں تھیں جینے کا دھنگ آئے

اس پاگ میں وہ منگ کے قابل کہانہ جائے
جب تک کسی ثمر کو مرا دل کہانہ جائے
شاخوں پہ نوک تیغ سے کیا کیا کھلے میں پھول
اندازِ لالہ کاری قتل کہانہ جائے
کس کے لہو کے رنگ ہیں یہ خارِ شوخ رنگ
کیا گلُّ کتر گئی رہ منزل کہانہ جائے
باراں کے نظر ہیں سمندر پتہ لب
احوالِ میز بانیِ اصل کہانہ جائے

میرے ہی سنگ و خشت سے تعمیرِ بام و در
میرے ہی گھر کو شہر میں شامل کہانہ جائے
زندگی کھلا ہے جب سے ہوئے ہیں رہا اسیر
ہر گام ہے وہ شورِ سلاسل کہانہ جائے
ہم اہلِ عشق میں نہیں حرفِ گنہ سے کھم
وہ حرفِ شوق جو سرِ مخفی کہانہ جائے
حسِ ہاتھ میں ہے یعنی جفا اس کا نام لو
مجسروج سے تو سائے کو قاتل کہانہ جائے

وہ تو گیا، یہ دیدہ خونبار دیکھئے
دامن پہ رنگ پیر ہمیں میار دیکھئے
دکھلا کے وہ تو لے بھی گیا شوخی خرام
اب تک ہمیں رقص میں درودیوار دیکھئے
اٹھتا کے ہم نے توڑی تھی زنجیر نام و ننگ
اب تک فضنا میں ہے وہی جھنکار دیکھئے
سینے میں چھپ گیا ہے طلوع سحر کے ساتھ
اب شاخِ دل پہ وہ گلِ رخسار دیکھئے

بِرْ قِ تَبَيِّدَهُ، بَادِ صَبَا، شَحَدَهُ اُورَهُم
ہُنَّ کَیْسَے کَیْسَے اُس کے گُرْقَار دِیکھَنَے
پِلَّے بَھَی تَبَرَّوْتَھَے پُرْ اُس دِلْتَشِیں کے ساتھ
ہَچَمْ نَمْ یَ مَسْتَیِ رَفَتاَر دِیکھَنَے
مَجَزَّرَوْح کے لَبُوں سے یَخْوِشِیونَه جَاسِکَی
خَشِی جَوْ اُس نَهَ دَوَلَتِ بَیدَار دِیکھَنَے

داغ سے ہیکی ہوئی زخموں سے لالہ پیسہ رہن
کس قدر ملتی ہے شاخِ در و سے شاخِ جمن

فرشِ گل مینائے مجھے شمع سحر ساز سخن
سب اُٹھے لیکن نہ اُٹھا میں خرابِ اجمن

مژده اے یار ان تشنہ دل سے کچھوڑا پھر لہو
اے شبِ تارِ عزیز اے پھر حبلا داغِ کہن

سماں میں یہ شورشِ غسم لائے مطلب کس طرح
اُس کی دھن پا بستدِ نئے نغمہ بھارا تے شکن

دیکھئے کب تک بلائے چال رہے اک حرفِ شوق
دلِ حرصِ گفتگو اور حپشِم خوبیاں کم سخن

سچ تو ہے مجرِ وح نے اُس گل سے کچھ پیاں لئے
یہ خبر لیکن کہاں سے لے اڑا مرغِ جمن

خچر کی طرح بُوئے سمن تیز بہت ہے
موسم کی ہوا اب کے جنوں خیز بہت ہے

راس آئے تو ہر سر پیٹ چھاؤں گھنی ہے
ہاتھ آئے تو ہر شاخ مشرد نیز بہت ہے

لوگو مری گل کاری وحشت کا صدہ کیا
دلیوانے کو اک حرفِ دل اوزیز بہت ہے

مصلوب ہوا کوئی سر را ہمت
اُدازِ جَسَرِ س پچھلے پہر تیز بہت ہے
جسروح سُنے کون ترمی تلخ نوائی
گفتارِ عزیزاں شکرِ امیر بہت ہے

لَتَامِنْگِيَشْكَرَ كَے تَام

بُجھ سے چلتا ہے سرِ بزمِ سُخن کا جارو
چاند لفظوں کے نکلتے ہیں مرے سینے سے
میں رکھتا ہوں خیالات کے چہرے سب کو
صور میں آتی ہیں باہر مرے آئینے سے

ہاں مگر آج مرے طَرِزِ بیاں کا یہ حال
بے وطن ہو گئے اپنے ہی وطن میں جیسے
وہ خیالوں کے صنم اور وہ الفاظ کے چاند

پھر بھی کیا کم ہے جہاں رنگِ خوشبو ہے کوئی
تیرے ہنوں سے مہک جاتے ہیں انکا مرے
سرحدیں توڑ کے اڑ جلتے ہیں اشعا مرے

تجھ کو معلوم نہیں یا تجھے معلوم بھی ہو
وہ سیئے نخت جنھیں غم نے سُتایا بر سوں
ایک لمحے کو جو سن لیتے ہیں نغمہ تیرا

جس گھری دُوب کے آنگ میں تو گاتی ہے
آئیں پڑھتی ہے سازوں کی صدا تیرے لیئے
دُم بدم خیر مناتے ہیں تری چنگ رباب

نغمہ و ساز کے زیور سے رہے تیرا سنگار
ہو تری آنگ میں تیرے ہی سروں کی انشاں
تیری تانوں سے تری آنکھ میں کاجل کی لکیسر

نوحہ سجاد ظہیر

ناخُنْ فَسْمَ سَعِيدٌ
دُوْسْتُو بَهِينَك دُوا بَهِاتِه سَعِيدٌ قَرْطَاسْ تَدْلِيم
نَقْشُ غَمْ رُوز اَزْل سَعِيدٌ بَهِي بَلْتَى بَرْكَاتِي تَصْوِير
فَرْقِ اَخْبَرْمَ پَهِينَ دِيدَه حِسَارْ سَعِيدٌ كَهُو
سَوْجَهْتَ اَهِي بَهِينَ كَچَهْ تُوهِي بَتَادِيدَه تَر
آه وَه بَاهِتَه كَهِيَانْ هَيَّهْ كَهِيَانْ كَيْنَ کَيْنَ تَغْيِير
چِبَنْ دَهِرْ سَعِيدَه کَانْٹُونْ کَيْ رِدا اوْرْ سَعِيدَه هُوَهْ مِنْ تَغْيِير

خَكْ رِخَارْ پَلْ اَے کُلْ خُورْ شِيدَه سَحَرْ

تَوْرَدَه اَسَندَ شَامَ کَو اَے مَاہِ نَيِّرْ

اَيْسَا غَنْخَوارِ جِنْوُنْ روَيَّهْ گَيْ جِبَکُو زَنجِير
لَيْ گِيادِ سَبْتِ اَجلِ چِھِينَ کَو دِلْوَالُونْ سَعِيدَه
خَامِشِي اَسَسْ کَيْ تَسِيمِ سَحَرِي سَعِيدَه گُويَا
بِيقِرارُونْ کَو گَھَنِي چَھَاوُنْ سَعِيدَه اَسَسْ کَيْ تَقرِير
بَھَرَگِي لَالَّه وَگَلْ سَعِيدَه جَسَے جَانَه وَلا
شَايِدَه اَوارَه رَكَھَه اَور اَيْهِي خَوابِ سَحَرْ
نَقْشِ دِلْوارِ سَعِيدَه خَامِوشِي هِيں اَربَابِ سَخْنِي
اَشَكْ آلوَدَه ہُونِي مِيرِي غَزَلِ اَسَسْ کَيْ بعد

نَامِ لَتَّه کَا ہَوا نَوْحَه سَجادِ ظَهِير

يَادَدَاشْت

يَادَدَاشْت

